مسئلہ کشمیر اور امریکی پالیسی ۱۹۹۰ء کی دہائی میں

ڈاکٹر الطاف اللہ*
ڈاکٹر فضل ربی**

Abstract

The decade of 1990's was marked by a shift in the US policy on the issue of Kashmir. According to US policy both Pakistan and India should resolve their dispute over Kashmir through negotiations and confidence building measures. To ensure human rights protection, it cut off aid to India for human rights violations in Jammu Kashmir. Similarly, it insisted Pakistan to stop supporting the militant groups in Kashmir and even it was about to declare Pakistan as a terrorist state on the issue. Pakistan was upset with the US policy, as the latter pressurized the former for supporting the Kahsmiri liberation movement. When the issue of Kashmir brought South Asia to the brink of a nuclear confrontation (1990 and 1999), the US played the role of crisis management cataylist between the two countries that resulted in a peaceful withdrawal of troops, and restrained to play any role in the resolution of the Kashmir problem. The question of plebiscite, election, human rights violations in the Indian held Kashmir, the link between the nuclear issue and Kashmir and the role of the US as a mediator; are some of the issues that exposed the inconsistency of US policy towards the issue of Kashmir in the 1990s. In this context, the present research paper provides academic and impartial analysis of US policy towards the issue of Kashmir during 1990s and its impact on Pak-US relations as well.

---

* ریسرچ فیلو، قومی ادارہ برائے تحقیقِ تاریخ و ثقافت، قائد اعظم یونیورسٹی، اسلام آباد۔
** اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ مطالعہ پاکستان، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز (NUML) اسلام آباد۔

مسئلہ کشمیر پاکستان اور بھارت کے درمیان ایک علاقائی تنازعہ ہے لیکن اپنی نوعیت کے اعتبار سے اسکو ایک بین الاقوامی پیچیدہ مسئلہ کہا جاتا ہے۔ اگر پاکستان اور بھارت کے تعلقات کا تاریخی جائزہ لیا جائے تو ان دونوں ممالک کے تنازعات میں سب سے بڑا مسئلہ کشمیر کا ہے۔ امریکہ کے ساتھ ان دونوں ممالک کے تعلقات میں بھی مسئلہ کشمیر کو ایک تاریخی اور سیاسی اہمیت حاصل ہے۔

امریکہ اور سوویت یونین کے درمیان جب سرد جنگ ختم ہوئی اور سوویت یونین بکھر گیا تو امریکہ دنیا میں ایک واحد طاقت بنی۔ اس لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ سرد جنگ کے بعد امریکہ کا مسئلہ کشمیر میں کیا کردار رہا۔ اس مطالعے میں امریکہ کا کشمیر کے مسئلے میں کردار اور اسکا پاکستان اور امریکہ کے تعلقات پر مرتب اثرات کا جائزہ لینا ہے۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد مغربی بلاک اور کمیونسٹ بلاک کے درمیان ایک طویل سرد جنگ شروع ہوئی۔ یہ جنگ دراصل سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکیت پر مبنی نظام کے درمیان تھی۔ جس میں جنوبی ایشیاء کے ممالک کا کردار انتہائی ضروری سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ امریکہ اور سوویت یونین دونوں نے پاکستان اور بھارت پر اپنا اپنا اثر و رسوخ ڈالنے کی تگ و دو شروع کی۔ بھارت کو سوویت یونین کا اتحادی تصور کیا جاتا رہا جب کہ پاکستان امریکہ کا اتحادی ملک بنا۔ امریکہ اور سوویت یونین کے درمیان یہ جنگ تقریباً چار دہائیوں تک جاری رہی، اعلیٰ طاقتوں کے درمیان دشمنی مسئلہ کشمیر کے حل میں رکاوٹ رہی اور اسطرح سے مسئلہ کشمیر سرد جنگ کا شکار رہا۔

اقوام متحدہ نے مسئلہ کشمیر کے حل کرنے کے حوالے سے۱۹۴۸ء اور ۱۹۴۹ء میں دو قراردادیں منظور کیں تھیں اور امریکہ سلامتی کونسل میں اس مسئلے کے حل کیلئے کوشش کرتی رہی لیکن ہمیشہ ناکام رہی۔ کیونکہ روس ہمیشہ سلامتی کونسل کے فورم پر مسئلہ کشمیر کے حل میں رکاوٹ ڈالتا رہا۔ اقوام متحدہ کے سلامتی کونسل میں جب بھی کوئی قرارداد مسئلہ کشمیر کے حوالے سے پیش ہوئی روس نے اپنے ویٹو کے اختیارات استعمال کرتے ہوئے اس کو روکا۔ کچھ حلقوں کے تحت روس کا یہ رویہ پاکستان کاامریکہ کا اتحادی بننے اور دفاعی معاہدوں میں

شمولیت کے خلاف ردِعمل تھا۔ اس طرح پاکستان کو امریکی سفارتی حمایت اور معاشی و دفاعی امداد علاقے میں اشتراکی نظام کے اثر و رسوخ کا مقابلہ کرنے کیلئے دیا گیا۔ اور اسکا مقصد ہرگز یہ نہیں تھا کہ بھارت پر دباؤ ڈالا جائے تا کہ کشمیر کا مسئلہ حل کیا جا سکے۔ ساتھ ساتھ جنوبی ایشیاء میں چینی طاقت اور اثر و رسوخ کے روک تھام کیلئے امریکہ بھارت کو دفاعی امداد دیتا رہا اور کبھی بھی بھارتی حکومت پر دباؤ نہیں ڈالا کہ کشمیر کا مسئلہ حل کرے۔۱

امریکی سی آئی اے کی دستاویزات سے واضح ہوتا ہے کہ پاکستان کیلئے کشمیر کی اہمیت سے امریکہ اچھی طرح واقف تھا پاکستان میں کوئی بھی حکومت کشمیر پر اپنا موقف ترک نہیں کر سکتی تاہم امریکہ دنیا بھر میں کمیونزم کے خلاف اپنی قیادت کے بارے میں فکر مند رہا اس لئے اس نے ہمیشہ کوشش کی کہ پاکستان اور بھارت دونوں اُس کے دوست رہیں۔''۲

اسی وجہ سے مسئلہ کشمیر امریکہ کے عالمی تناظر کی پالیسیوں کا کبھی بھی حصہ نہیں بن سکا اور نہ ہی امریکہ نے اس مسئلہ کو حل کرنے کیلئے اتنی اہمیت دی۔۳

ذوالفقار علی بھٹو لکھتے ہیں ''پاکستان دو طرفہ یا کثیر الملکی ذرائع یا امریکہ کے مفادات کے ساتھ رہتے ہوئے کبھی بھی امریکی نقطہ نظر کو تبدیل کرنے میں کامیاب نہیں رہا۔ کہ امریکہ کو اس بات پر قائل کر سکے کہ وہ اپنے اثر و رسوخ کو استعمال کرتے ہوئے بھارت کو ہمارے تنازعات (بشمول کشمیر) کو حل کرتے۔ جب کہ پاکستان کے ساتھ دوستانہ اور اتحادی تعلقات رکھتے ہوئے امریکہ بھارت پر اپنے اثر و رسوخ ڈالنے سے ہچکچاہٹ کرتا رہا حالانکہ وہ ایسا کرنے کی پوزیشن میں تھا، تاہم ایک منصفانہ تصفیہ فروغ دینے کیلئے اس نے کوئی سنجیدہ کوشش کی ہی نہیں۔''۴

سرد جنگ کے دوران بھی مسئلہ کشمیر کے حوالے سے امریکی پالیسی کبھی بھی مسلسل اور توجہ مرکوز نہیں رہی۔ بلکہ وہ ہمیشہ اس معاملے پر ایک اخلاقی فیصلہ منظور کرنے سے گریزاں رہا۔ امریکہ کا اسطرح کا رویہ ہمیشہ اسکے قومی مفادات کے عین مطابق رہا۔

۱۹۹۰ء عشرے کے ابتداء میں سوویت یونین کے ٹوٹنے کے بعد، امریکی پالیسی دانوں کی نظر میں پاکستان کی اہمیت ختم ہو چکی تھی۔ کیونکہ کمیونزم کے پھیل جانے کا خطرہ ٹل گیا

تھا اور نئے عالمی نظام میں پاکستان امریکہ کیلئے کوئی مفید ملک ثابت نہ ہو سکا۔ یہی وجہ تھی کہ دونوں ممالک کے درمیان جوہری معاملے پر سنگین اختلافات پیداہوئے اور امریکہ نے پریسلر ترمیم کے تحت پاکستان پر اقتصادی اور دفاعی پابندیاں لگائیں۔ جس نے پاکستان کو حیران کر دیا۔ دوسری جانب امریکہ نے اقتصادی ترقی اور سرمایہ کاری کی وجوہات پر بھارت کے ساتھ تعلقات بڑھائے۔۵

عالمی سطح پر ان تبدیلیوں کو مد نظر رکھتے ہوئے کشمیریوں نے اپنی آزادی کیلئے ایک عوامی تحریک شروع کی اور خصوصاً نوجوان طبقے نے متنازعہ ریاست میں بھارتی حکمرانی کے خلاف مسلح جدوجہد کی شروعات کی۔ چونکہ پاکستانی عوام جذباتی طور پر کشمیریوں کے حق خودارادیت کے ساتھ منسلک رہیں اس لیے حکومتِ پاکستان نے کشمیری مزاحمت کی حمایت شروع کی جو کہ بھارت کے ساتھ امریکہ کو بھی قابل قبول نہیں تھی۔ اس طرح سے پاکستان اور بھارت کے درمیان اختلافات بڑھتے گئے اور امریکہ صورت حال پر قابو پانے کیلئے سہولت کاری اور ثالثی کا کردار ادا کرتا رہا۔

مزید برآں ایک خالصتاً قوم پرست تنظیم جموں و کشمیر لبریشن فرنٹ منظر عام پر آئی جو ۱۹۹۰ء کے ابتدائی عشرے سے کشمیری جدوجہد کی قیادت کرتی رہی۔ اس نے کشمیری خود مختاری کا مطالبہ کر کے پاکستان اور بھارت کے درمیان علاقای تنازعہ کشمیر کے روایتی دعوے کو تبدیل کر دیا۔ اور اس طرح تاریخ میں پہلی مرتبہ کشمیر کے تنازعہ میں کشمیری لوگ بذاتِ خود ایک اہم کردار بنے۔

پاکستانی عوام، سول سوسائٹی اور میڈیا نے کشمیریوں کی خود ارادیت کے جدوجہد کی حمایت کی جبکہ بھارت نے اپنے تمام تر وسائل کو بروئے کار لاتے ہوئے اسکا راستہ روکنے کی کوششیں کیں اور آرمڈ فورسز ایکٹ، جموں و کشمیر پبلک سیفٹی ایکٹ، دہشتگردی اور تباہ کن سرگرمیوں وغیرہ جیسے کالے قوانین کو بروئے کار لاتے ہوئے کشمیری مزاحمتی تحریک کو دبانے کی کوششیں کی۔ کشمیری عوام پر تشدد کے ساتھ ساتھ بے گناہ شہریوں کا قتل عام بھی کیا۔

ایک اندازے کے مطابق تقریباً اکاسی ہزار(81,000) کشمیریوں کو قتل کیا گیا اور ایک

لاکھ سے زائد(100,000) گھروں اور دکانوں کو لوٹ لیا اور جلایا تقریباً8000عورتوں کو بے آبرو کیا گیا اور ایک لاکھ سے زیادہ بچوں کو یتیم بنایا۔

کشمیریوں کے حقِ خود ارادیت کی تحریک کو بھارت نے عالمی سطح پر دہشتگردی اور بنیاد پرستی کی لہر کا حصہ قرار دیا اور ساتھ ساتھ پاکستان پر الزامات لگائے کہ ان کو اسلحہ فراہم کرتا ہے۔ پاکستان نے ان الزامات کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ کشمیریوں کی جدوجہد حقیقی قومی آزادی کی تحریک ہے اور پاکستان اس تنازعہ میں فریق ہونے کے ناطے کشمیریوں کے منصفانہ اور جائز جدوجہد میں ان کی اخلاقی اور سیاسی حمایت کرتا رہے گا۔ ۱۹۹۰ء کے ابتدا ہی میں مسئلہ کشمیر کو بین الاقوامی توجہ حاصل ہوئی۔ اسلیے بین الاقوامی برادری اور خاص طور پر امریکہ کو اس تنازعہ میں اپنا کردار ادا کرنا چاہیے تھا تا کہ پاکستان اور بھارت کے درمیان اس تاریخی مسئلے کو حل کر سکے۔ چونکہ سرد جنگ کے اختتام پر جنوبی ایشیاء میں امریکی مفادات تبدیل ہو چکے تھے تاہم مسئلہ کشمیر پر امریکہ کا موقف وہی رہا کہ یہ ایک متنازعہ علاقہ ہے۔[۶] ۶ مارچ ۱۹۹۰ء کو امریکی اسسٹنٹ سیکرٹری جان کیلی نے کہا کہ ''امریکہ جموں وکشمیر ایک متنازعہ علاقہ تصور کرتا ہے اور دونوں ممالک پر زور دیتا ہے کہ اسے شملہ معاہدہ کے مطابق حل کرے'' انہوں نے کہا کہ'' ہم بھارتی دعوے کو قبول نہیں کرتے کہ کشمیر بھارت کا ایک حصہ ہے اور بھارتی سکیورٹی فورسز کی طرف سے انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے حوالے سے ہم بار بار تشویش کا اظہار کرتے رہیں''۔[۷]

اس طرح سے امریکہ نے پہلی مرتبہ کشمیری عوام کی خواہشات کو مد نظر رکھتے ہوئے کشمیریوں کی حوصلہ افزائی کی۔ دوسری طرف کشمیریوں کے مزاحمتی تحریک نے بھارت کو کافی خوفزدہ کیا تھا اور انہوں نے پاکستان پر الزامات کو بڑھائے یہاں تک کہ بھارتی وزیراعظم وی پی سنگھ نے ۱۰ اپریل ۱۹۹۰ء کو پارلیمنٹ میں اعلان کیا کہ ''پاکستان کو ان سرگرمیوں کی بھاری قیمت ادا کرنا پڑے گی''۔ بھارت نے اپنی افواج کو پاکستانی سرحد پر اکٹھا کیا اور اسطرح سے موسم بہار ۱۹۹۰ء میں مسئلہ کشمیر پر بڑھتی ہوئی کشیدگی نے دونوں ممالک کو جنگ کے دہانے پر کھڑا کر دیا۔[۸]

اسلام آباد اور نئی دہلی میں امریکی سفیر رابرٹ اوکلے اور ولیم کلارک نے دو ہمسایہ ممالک کے درمیان ایک ایٹمی جنگ کا خدشہ محسوس کیا اور بُش انتظامیہ کو خبردار کیا۔[9] امریکی پالیسی گردش میں آ گئی اور بُش انتظامیہ کے قومی سلامتی کے مشیر رابرٹ ایم گیٹس اور جان کیلی نے خطے میں کشیدگی کو کم کرنے کیلئے جنوبی ایشیاء کا دورہ کیا۔

صدر غلام اسحاق سے ملاقات کرتے ہوئے رابرٹ گیٹس نے کہا کہ ''ہم دونوں ممالک کے درمیان بیان بازی اور کشیدگی کو کم کرنے اور اعتماد سازی کے اقدامات پر زور دے رہے ہیں۔'' اس نے صاف کہا کہ ''امریکہ ہرگز ثالثی کردار کا خواہاں نہیں۔''

صدر غلام اسحاق خان نے امریکی حکام سے کہا کہ پاکستان جنگ نہیں چاہتا اور پاکستان کا کشمیریوں کی حمایت مکمل طور پر سیاسی ہے۔ انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ اس خطے میں پائیدار امن کیلئے بنیادی مسئلے کو حل کرنا لازمی ہے کہ ''اقوام متحدہ کے قراردادوں کے مطابق کشمیری عوام کو حقِ خود ارادیت کا حق دیا جائے۔''[10]

امریکی سینٹر ایلن کولینٹس نے بھی دونوں ممالک کا دورہ کرتے ہوئے اعلیٰ حکام کو خبردار کیا کہ پاک بھارت جنگ دونوں ممالک کے عوام کیلئے مصیبت زدہ ہو گی۔'' امریکہ کے علاوہ سوویت یونین نے بھی پاکستان اور بھارت پر دباؤ ڈالا۔ بالآخر دونوں ممالک پاکستان اور بھارت نے مذاکرات پر اتفاق کیا اور اس طرح سے جنگ کا خطرہ ٹل گیا۔[11]

پاک بھارت قریب جنگی صورتحال نے امریکہ کی نظریں پاکستان کے جوہری پروگرام کی طرف متوجہ کیں۔بُش انتظامیہ نے پریسلر ترمیم کے تحت اکتوبر ۱۹۹۰ء میں پاکستان پر دفاعی اور اقتصادی امداد کی پابندی عائد کی جو کہ حقیقت میں پاکستان کیلئے ایک جھٹکا تھا۔ تاہم امریکہ کے سفارتی اور اقتصادی دباؤ کا پاکستان کے جوہری پروگرام پر کوئی اثر نہ پڑا۔ بلکہ پاکستان کو اپنے قومی سلامتی کیلئے جوہری پروگرام پر انحصار بڑھ گیا۔

سرد جنگ کے بعد امریکہ نے پاکستان کی امداد سے پیٹھ پھیر لی اور بھارت کے ساتھ اقتصادی تعلقات کو مستحکم کرنے کی کوشش کی۔ حالات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بھارت نے کشمیری جدوجہد آزادی کو اسلامی انتہا پسندی اور بنیاد پرستی کے نام سے مشہور کرنے کی

کوشش کی۔

۱۹۹۲ء میں اپنے صدارت کا عہدہ سنبھالتے ہوئے صدر کلنٹن نے دنیا میں خونریز تنازعات پر امریکی نئی پالیسی بنائی جس کی وجہ سے مسئلہ کشمیر پر امریکی مؤقف میں بھی تبدیلی آئی۔ مسئلہ کشمیر پر امریکی مؤقف کی تبدیلی کا اندازہ ڈپٹی اسسٹنٹ سیکرٹری جان مالوہ کے اس بیان میں واضح نظر آتی ہے اس نے کہا کہ امریکہ چاہتا ہے کہ ''پاکستان اور بھارت اپنے تمام تنازعات باہم مذاکرات اور اعتماد سازی کے ذریعے سے حل کرے۔ کشمیر کا مسئلہ پاکستان اور بھارت کے درمیان بہت اہم ہے اور اسے حل کرنا چاہئے امریکہ ثالثی کا کردار تب ادا کرے گا جب دونوں ممالک راضی ہوں۔''

کلنٹن انتظامیہ نے مسئلہ کشمیر کے حوالے سے تین نکات والی پالیسی پیش کی:

۱۔ شملہ معاہدہ مسئلہ کشمیر کیلئے ایک بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔

۲۔ بھارت کو جموں و کشمیر میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کو روکنا چاہیے اور پاکستان کو کشمیر میں عسکریت پسندوں کو فوجی امداد بند کرنا چاہیے۔

۳۔ کشمیری عوام کی خواہشات کے مطابق مسئلہ کشمیر کو حل ہونا چاہیے۔[۱۲]

مئی ۱۹۹۳ء میں صدر کلنٹن نے بھارت کے دورے پر کہا کہ مسئلہ کشمیر کو شملہ معاہدے کے تحت دونوں ممالک کو حل کرنا چاہیے اور امریکہ کسی خاص حل کی وکالت نہیں کرتا۔ انہوں نے امریکی پالیسی کے تین اصول بیان کیے کہ (۱) امریکہ جموں و کشمیر کی پوری ریاست کو متنازعہ علاقہ سمجھتا ہے۔ (۲) کشمیریوں، مسلمانوں اور غیر مسلموں کے خیالات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس مسئلے کو پاکستان اور بھارت امن سے حل کرے۔ (۳) دونوں اطراف کی خواہش پر امریکہ اس عمل میں مددگار ثابت ہونے کیلئے تیار ہے۔[۱۳]

اسطرح سے امریکہ کے اسسٹنٹ سیکرٹری آف سٹیٹ رابن رافیل نے کلنٹن انتظامیہ کی کشمیر پالیسی پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا:

پہلا: ہم مسئلہ کشمیر کو مذاکرات کے ذریعے حل کرنے کے حامی ہیں ہماری توجہ یہ نہیں کہ اسے کیسے شروع کرے بلکہ یہ کہ کس طرح ختم کیا جاسکتا ہے۔

دوسرا: ہم شملہ معاہدے کے ذریعے اس مسئلے کو حل کرنے کی حمایت کرتے ہیں۔
تیسرا: ہم سیاسی عمل کی حمایت کرتے ہیں تا کہ کشمیر میں جنگ ختم ہو جائے۔
چوتھا: ہمیں پتہ ہے کہ عسکریت پسند، بھارتی سکیورٹی فورسز کے خلاف کارروائی میں مصروف ہیں۔
پانچواں: ہم عسکریت پسندوں کو باہر سے امداد کے مخالف ہیں۔[۱۴]

امریکہ کی اس قسم کی پالیسی، اسکی بین الاقوامی قومی مفاد کے عین مطابق تھی کیونکہ کلنٹن انتظامیہ نے پوری دنیا میں ایٹمی عدم پھیلاؤ اور انسانی حقوق کے پامالی وغیرہ کے ایجنڈے پر زور دیا تھا اور اسی وجہ سے انسانی حقوق سے وابستگی کا اظہار کرنے کیلئے بھارت کو امداد بند کر دی تھی تا کہ کشمیر میں بھارت انسانی حقوق کے پامالی کو چھوڑ دے۔[۱۵] امریکہ نے پاکستان کو بھی خبردار کیا کہ عسکریت پسندوں کی امداد چھوڑ دے۔

رائے شماری 'انتخابات' انسانی حقوق اور مسئلہ کشمیر کے حل میں امریکی کردار اور پالیسی کا جائزہ درجہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے:

رائے شماری

مسئلہ کشمیر کے حوالے سے امریکی پالیسی میں تضاد کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس نے کشمیر کو ایک متنازعہ علاقہ مان لیا ہے۔ لیکن اقوام متحدہ کے زیر اہتمام 'رائے شماری' سے اجتناب کیا ہے۔ رابن رافیل نے کانگریسی پینل کے سامنے اپنے تحریری بیان میں کہا کہ اقوام متحدہ کی قرارداد کے مطابق مسئلہ کشمیر کو رائے شماری کے ذریعے حل کرنے پر زور دیتا ہے لیکن زمینی حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے کسی دوسرے طریقے سے اسکا حل تلاش کرنے کا وقت آ گیا ہے۔

امریکہ کے دوسرے حکام اور سکالرز اسی نقطہ نظر کا اظہار کئی مرتبہ کرتے رہے۔ بھارت میں امریکی سفیر فرینک وسنر نے بیان دیا کہ مسئلہ کشمیر کے شورش زدہ تاریخ اور ماضی کے مفروضوں کو سامنے رکھتے ہوئے دونوں ممالک کو اس مسئلے کے حل کیلئے اور کسی

نتیجے پر پہنچنے کیلئے ایک تازہ نظر کی ضرورت ہے۔

مندرجہ بالا بیان سے تضاد رکھتے ہوئے امریکی سینٹر ہانک بدآؤن نے اگست ۱۹۹۶ء میں بھارت، پاکستان اور افغانستان کے دورے پر کہا کہ ''اقوام متحدہ کی قراردادوں کا موجودہ مسئلے پر اثر پڑتا ہے تاہم پاکستان اور بھارت کو مسئلہ کشمیر حل کرنے کے لیے براہ راست مذاکرات جاری رکھنا چاہیے۔''[۱۶]

اسطرح سے امریکہ کشمیر کے متنازعہ حیثیت کو قبول کرنے کے باوجود اس مسئلے کو اقوام متحدہ کے قراردادوں کے مطابق حل کرنے کے حق میں نہیں۔ بلکہ باربار پاکستان کو یاد دہانی کرائی گئی کہ پاکستان اپنے موقف پر ایک تازہ نظر ڈالے۔ کیونکہ امریکہ کے ہاں بھارتی جمہوریت زیادہ آزاد اور کھُلی بن چکی ہے اس لیے پاکستان کو دوسری طرف کی اقدار پر ایک نظر رکھنی چاہیے۔

کلنٹن انتظامیہ مسئلہ کشمیر کو ایک باہمی تنازعہ کہتی رہی اور پاکستان بھارت کے درمیان براہ راست مذاکرات کی دعوت دیتی ہے اور ساتھ کشمیریوں کو اس مرحلے میں شامل کرنے کا کہتی رہی۔ تاہم اقوام متحدہ کی دونوں قراردادوں (۱۳ اگست، ۵ جنوری ۱۹۴۹ء) اور رائے شماری کے ذکر سے اجتناب کرتی رہی۔ جس میں کشمیریوں کو یہ حق دیا گیا تھا کہ وہ اپنے مستقبل کا فیصلہ انتخابات کے ذریعے کرے کہ مستقل بنیادوں پر بھارت یا پاکستان میں شامل ہو جائے۔[۱۷]

انسانی حقوق کے مسائل

آزادی کشمیر کے تحریکوں کو کچلنے کیلئے بھارت نے کالے قوانین کے تحت کشمیریوں کو دبانے کی کوشش کی اور فوجی کارروائیوں کے دوران ہزاروں معصوم لوگوں کا قتل عام کیا، عورتوں کی عصمت دری کی اور معصوم بچوں کو ظلم وستم کا نشانہ بنایا۔ انسانی حقوق کے خلاف ورزی پر بھارت کو بین الاقوامی برادری کی جانب سے تنقید کا سامنا کرنا پڑا۔ امریکی حکام نے بھارتی سکیورٹی فورسز کی طرف سے ضرورت سے زیادہ انسانی حقوق کی خلاف ورزی پر

اپنی تشویش کا اظہار کیا۔ رابن رافیل نے اکتوبر ۱۹۹۳ء میں کہا ''لوگوں کو غائب کرنا قتل کرنا، پھانسی دینا اور حراستی اموات وغیرہ ایسے واقعات ہیں۔ جس کو چھپانے کیلئے کوئی بہانا نہیں۔ ہم کشمیر کو ایک متنازعہ علاقہ سمجھتے ہیں۔ اور بھارت کے دستاویز الحاق کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ کشمیر ہمیشہ کیلئے بھارت کا اٹوٹ انگ ہے۔''۱۸

اس سے پہلے کسی بھی امریکی اہلکار کی طرف سے اس طرح کا تنقیدی بیان سامنے نہیں آیا تھا یہ مسئلہ کشمیر پر پاکستان کی جانب سے امریکی عنوان کا ایک واضح اظہار تھا۔ اسلیے اس بیان نے بھارت کو شدید ردعمل پر اُکسایا اور بھارتی میڈیا نے ہندوستانی اتحاد کو مجروح کرنے کا دعوی کیا۔ تاہم امریکی حکام نے کئی مرتبہ بھارت کو کہا تھا کہ کشمیر میں انسانی حقوق کا خیال رکھے لیکن بھارت نے کبھی توجہ نہیں دی اور کشمیریوں کے ساتھ بدترین سلوک کو جاری رکھا۔ جون ۱۹۹۳ء میں جان میلاٹ نے بھارت کا دورہ کیا اور بھارت کو کشمیر میں انسانی حقوق کے خیال رکھنے کی یاداشت پیش کی۔۱۹

۱۹۹۶ء میں صدر کلنٹن نے بھی بھارتی حکام کو کشمیر میں انسانی حقوق کو بہتر کرنے کی سفارش کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ انسانی حقوق کے خلاف ورزیوں کو کم کرے، بین الاقوامی تنظیموں کو رسائی کی اجازت دیں اور کشمیر میں جمہوری عمل کی بحالی کیلئے سیاسی مذاکرات کی حوصلہ افزائی کریں۔''۲۰

تاہم بھارت نے امریکہ کی بات نہ سنی اور کالے قوانین کے تحت کشمیر میں انسانی حقوق کے پامالی کو برقرار رکھا۔

انتخابات

بھارت نے ۱۹۹۶ میں کشمیر میں انتخابات کے انعقاد کا تہیہ کیا۔ انتخابات سے پہلے امریکی سفیر فرینک وسند نے بھارت کو یاد دہانی کرائی کہ جموں کشمیر میں ''ریاستی انتخابات آزادانہ، منصفانہ اور شفاف ہونا چاہیے۔''۲۱ اسلام آباد کے دورے پر اس نے کہا کہ ''امریکہ کشمیر میں سیاسی عمل کی حمایت کرتی ہے'' لیکن ہم انتخابات پر اپنی شناختی مہر نہیں لگا رہیں۔''۲۲

بھارت نے انتخابات کی نگرانی کیلئے بین الاقوامی مبصر ٹیم کو اجازت نہیں دی۔ تاہم اس کے باوجود بھی امریکہ نے بھارت کی ریاستی اسمبلی کے انتخابات کا خیر مقدم کیا اور اسے وادیٔ کشمیر میں تشدد کے خاتمے کیلئے ایک اہم قدم کے طور پر تسلیم کیا۔

بھارت نے جموں کشمیر میں انتخابات اپنے آئین کے تحت منعقد کئے جہاں امیدواروں کو مرکزی حکومت کو ایک بیعت پر دستخط کرنے کی ضرورت تھی۔ چنانچہ آل پارٹیز حریت کانفرنس نے انتخابات کا بائیکاٹ کیا۔ تاہم امریکہ کی طرف سے کوئی ردعمل سامنے نہیں آیا۔ انتخابات کے بعد جموں کشمیر کے حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے رابن رافیل نے کہا کہ ''ریاست میں تشدد کم ہو گیا اور انتخابات جو مکمل ہوئے اتنے برے بھی نہیں تھے۔''

اسکے برعکس اس نے کہا کہ ''کشمیر پر امریکی پوزیشن میں کوئی تبدیلی نہیں ہے۔''**۲۳** اس طرح امریکی مفاد کشمیر کے حوالے سے واضح ہو جاتے ہیں وہ ایک طرف کشمیریوں اور بھارتیوں کے درمیان اور دوسری طرف پاکستان اور بھارت کے مابین، کشیدگیوں کو کم کرنے کے کوشش کرتا رہا تاہم یہ اندازہ بھی لگایا گیا کہ امریکہ اقوام متحدہ کے رائے شماری کے متبادل مقبوضہ کشمیر میں انتخابات کو قبول کرنے کیلئے تیار تھا۔

مندرجہ بالا تجزیہ کے تحت یہ کہنا بجا ہو گا کہ کلنٹن دورِ حکومت کے دوران امریکہ مسئلہ کشمیر پر بھارتی پوزیشن کی طرف جھکا ہوا تھا تا کہ بھارتی مدار کے اندر کشمیریوں کو زیادہ سے زیادہ خودمختاری دی جائے۔

ثالث کا کردار

فروری ۱۹۹۷ء میں جموں یونیورسٹی کے خطاب میں وسنر نے مسئلہ کشمیر کے حل کیلئے مندرجہ ذیل نکات پیش کیے

- وادی میں سیاسی سکون کا بحال ہونا
- عوام کیلئے ایک اچھی اور مستحکم انتظامیہ کی فراہمی
- ریاست میں امن کی بحالی

- پولیس تشدد کا خاتمہ
- ریاست کی معاشی بحالی
- پاک بھارت کے درمیان بنیادی مسئلے کو حل کرنے میں شملہ معاہدے کی ناکامی [۲۴]

تاہم ۲۰ مارچ کو میڈیا کے سامنے اس نے ایک خود متضاد بیان میں یہ دعوی کیا کہ گزشتہ پچاس سالوں میں وادی کشمیر میں کئی تبدیلیاں رونما ہو چکی ہیں جس کی بنیاد پر کشمیر میں رائے شماری کا پاکستانی مطالبہ بے معنی ہو چکا ہے۔ تاہم کشمیر کے مستقبل کا فیصلہ کرتے ہوئے کشمیری عوام کے جذبات کا خیال رکھا جائے۔

وسنر کے اس قسم کے بیانات نے نہ صرف پاکستان کے وقار کو خراب کیا بلکہ بین الاقوامی سطح پر کشمیریوں کے مطالبات کو بھی نقصان پہنچایا۔ پاکستان کے طرف سے وسنر کے بیانات کے مذمت کی گئی۔ پاکستان کے وزیرخارجہ آصف احمد علی نے کہا کہ ''وسنر ایک شیطان وکیل کے طور پر کام کر رہا ہے اور اس کے بیانات امریکی پالیسی کا حصہ نہیں ہیں اور وہ اس تنازع کے زمینی حقائق کو نظرانداز کر رہا ہے۔'' [۲۵]

وسنر کے بیان کے اگلے دن ۲۲ فروری کو پاکستان میں امریکی سفیر تھامس سیمنس نے اپنا بیان جاری کیا کہ ہم پاکستان اور بھارت کے دو طرفہ مذاکرات کے ذریعے سے مسئلہ کشمیر کو پر امن طریقے سے حل کرنے پر یقین رکھتے ہیں۔ [۲۶]

پاکستان اور بھارت میں امریکی دو سفیروں کے بیانات میں تضاد اور شکوک امریکہ دوہری پالیسیوں کی اصلیت کو بے نقاب کرتا ہے۔ جس نے ایک طرف پاک بھارت دو طرفہ مذاکرات پر مبنی مسئلہ کشمیر کے حل کی حمایت کی اور دوسرے طرف دو طرفہ مذاکرات کی بنیاد پر تشکیل کیلئے شملہ معاہدے کو تسلیم کرنے سے انکار کیا۔

امریکی پالیسی نے جموں کشمیر میں بھارتی انتخابات کے موقف کی حمایت کی۔ جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ امریکہ کشمیر کے مسئلے کو بھارتی آئین کے تحت حل کرنا چاہتے تھے۔

وادی کشمیر میں کشیدگی کی صورت حال پر امریکہ نے اپنی تشویش کا کئی مرتبہ اظہار کیا تاہم اس نے پاک بھارت کے درمیان مسئلہ کشمیر پر ثالثی سے صاف انکار بھی کیا۔

امریکہ کی خارجہ تعلقات کی کونسل اور بروکنگ انسٹیٹیوٹ کی ایک رپورٹ میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ''مسئلہ کشمیر کے حتمی حل کیلئے ماحول تیار نہیں ہے، امریکہ یا کسی اور ملک کی ثالثی کیلئے بھی موزوں نہیں۔ ان حقائق کو مد نظر رکھتے ہوئے کشمیر کا مستقل سیاسی حل سفارتی سطح پر ناکامی کا مترادف ہے۔۲۷

سرد جنگ کے اختتام کے بعد اگر امریکہ کے عالمی سطح پر دفاعی اور اقتصادی مفادات کو مد نظر رکھا جائے تو یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مسئلہ کشمیر کو کوئی اہمیت حاصل ہی نہیں۔ اس لیے وادی کشمیر میں بدلتی ہوئی صورت حال کے حوالے سے امریکہ کے بیانات میں اختلافات اس حقیقت کو ظاہر کرتا ہے کہ امریکہ مسئلہ کشمیر میں ثالثی کیلئے تیار نہیں۔ اور وہ اپنے قومی مفادات کو سامنے رکھتے ہوئے اس خطے میں جمہوریت کی بحالی، دہشتگردی اور جوہری عدم پھیلاؤ پر توجہ دیتا رہا۔

پاکستان، بھارت اور کشمیری، کشمیر کے مسئلے کے حل کیلئے صدر کلنٹن کی دلچسپی کے حامی تھے مسئلہ کشمیر سے متعلق تین پارٹیوں، پاکستان، بھارت اور کشمیریوں کی یہ خواہش تھی کہ صدر کلنٹن اس مسئلے کے حل میں دلچسپی لیں۔ لیکن ان تینوں پارٹیوں کے مقاصد ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ پاکستان امریکی کی ثالثی کے حق میں تھا جبکہ بھارت کو کسی صورت یہ قبول نہیں تھا۔

دہشتگردی اور مسئلہ کشمیر

کلنٹن انتظامیہ کے دوسرے دور میں دہشتگردی پر قابو پانا امریکی خارجہ پالیسی کا اہم عنوان رہا۔ امریکی پالیسی دان اسلامی بنیاد پرستوں سے شدید خطرہ محسوس کرتے تھے۔ تھامس پکرنگ(Thomas Pickering) نے اکتوبر ۱۹۹۷ء میں بھارتی دورے پر کہا کہ '' امریکہ اور بھارت دونوں اس بات کے پابند ہیں کہ ملکر اپنی صلاحیتوں کو بہتر بنائے اور دہشتگردی کا مقابلہ کریں، چاہے دنیا کے کسی کونے میں ہو ۲۸ نومبر ۱۹۹۷ء میں امریکی وزیر خارجہ نے جنوبی ایشیاء کے دورے چاہیں دنیا کے کسی کونے میں سو پر اسی طرح کے خیالات کا اظہار کیا۔

تاہم بدلتے ہوئے حالات کے پیش نظر امریکی بھارتی تعلقات کے حوالے سے تھامس پکرنگ کے بیانات اہم سنگ میل گردانے جاتے ہیں کہ دہشتگردی کے مقابلے میں امریکہ بھارت ساتھ ساتھ کھڑا ہے۔

۲۱ اگست ۱۹۹۸ء کو امریکہ نے افغانستان میں اسامہ بن لادن کے کیمپوں کے خلاف فوجی کارروائی کی۔ اس فوجی کارروائی میں پاکستانی ہوائی حدود کو استعمال کیا گیا لیکن حیرت کی بات تھی کہ امریکہ نے حملے سے پہلے نہ پاکستان سے اجازت لی اور نہ آگاہ کیا تھا۔[۳۰]

اسطرح کے واقعات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بھارت نے دعوی کیا کہ حرکت المجاہدین کے سربراہ فضل الرحمان اسامہ بن لادن کے دوست ہیں اور امریکہ پر حملوں کرنے میں ملوث تھے۔ لہٰذا پاکستان کی طرف سے سخت احتجاج کے باوجود امریکہ نے ''حرکت الانصار'' کو دہشت گرد تنظیم قرار دیا۔

اسطرح سے ۱۹۹۸ء کے بعد امریکی اور غیر حکومتی اداروں نے دہشتگردوں اور کشمیری تحریک آزادی کے تنظیموں کے درمیان روابط کو اجاگر کرنا شروع کیا۔ بھارت نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کئی دفعہ جھوٹ پر مبنی رپورٹیں شائع کیں اور کشمیریوں کی حق خودارادیت کی تنظیموں کا دہشتگردوں کے ساتھ روابط کی جھوٹ کہانیاں بنائیں۔ اس کے پیچھے بھارت کا مقصد یہ تھا کہ دہشتگردی اور بنیاد پرستی کی آڑ میں امریکہ کی حمایت حاصل کرے دہشتگردی کے خلاف امریکی اور ہندوستانی تعاون نے ان دونوں ممالک کو قریب لانے میں اہم کردار ادا کیا اور امریکہ نے آہستہ آہستہ یہ بھارتی دعوی قبول کرنا شروع کیا کہ پاکستان پنجاب، شمالی علاقوں اور جموں و کشمیر میں دہشتگردی کی حمایت کرتا ہے۔ حالانکہ وہ جماعتیں جن کی پاکستان مدد کرتا تھا۔ حقیقت میں بھارت کے غاصبانہ قبضے کے خلاف آزادی کی جنگ لڑ رہی تھیں۔[۳۱]

کارگل جنگ اور امریکی ڈپلومیسی

امریکی کونسل آف فارن ریلیشنز کی ایک رپورٹ کے مطابق جب تک کشمیر کا مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ برصغیر میں مستقل بنیادوں پر امن قائم نہیں ہو سکتا۔ امریکہ نے پاک بھارت

تنازعات کو حل کرنے کیلئے دونوں ممالک کے ساتھ کام کرنے کی طرف اشارہ کیا۔۳۲ مئی ۱۹۹۷ء میں بھارتی وزیراعظم گجرال اور وزیراعظم نواز شریف کے درمیان مالدیپ میں ملاقات ہوئی۔ اور دونوں ممالک کے درمیان متنازعہ مسائل بشمول کشمیر پر مستقل بحث کیلئے مشترکہ ورکنگ گروپ قائم کرنے پر اتفاق کیا۔

گجرال نے اس ملاقات کو ''بہت گرم'' بہت دوستانہ جبکہ نواز شریف نے ''تعمیری اور با معنی'' قرار دیا اور کہا کہ ''ہم نے ان مسائل کو حل کرنے پر بات کرنے کا اتفاق کیا جسکو ہم نے ۵۰ سال میں حل نہیں کیے تھے۔۳۳ امریکہ نے پاک بھارت وزرائے اعظم کی پہل کو خوش آمدید کہا۔ اور صدر کلنٹن نے خوشی کا اظہار کیا کہ بالآخر دونوں وزیراعظم ایسے مسائل کو حل کرنے پر اتفاق کر چکے ہیں۔ جنھوں نے پاکستان اور بھارت کو تقسیم کیا ہے۔ تاہم یہ ساری کوششیں ناکام رہی۔ کیونکہ ۱۹۹۸ء میں بھارت اور پاکستان دونوں نے ایٹمی دھماکے کیے جسکی وجہ سے کشمیر کا مسئلہ اب دونوں ممالک کے درمیان ایک ''نیوکلیئر فلیش پوائنٹ'' کے نام سے پکارا گیا۔۳۴

ایٹمی دھماکوں اور مسئلہ کشمیر کے درمیان ایک تعلق بناتے ہوئے بھارتی حکومت نے ایک بیان جاری کیا کہ ''اب پاکستان کو آزاد کشمیر چھوڑنا ہو گا۔ پاکستان کو زمینی حقائق قبول کرنے ہونگے اور نئی بھارتی ایٹمی قوت کشمیر کے مستقبل کا فیصلہ کریگی''۔

امریکی حکومت نے بھی ایٹمی دھماکوں اور تنازعہ کشمیر کے درمیان تعلق کا اعتراف کیا جبکہ امریکی وزیر خارجہ نے بیان دیا کہ ''ہمیں یقین ہے کہ اندرونی ملکی سیاست اور مسئلہ کشمیر نے بھارتی ایٹمی دھماکوں میں اپنا کردار ادا کیا ہے اور جنوبی ایشیاء میں کشیدگی کا بنیادی سبب مسئلہ کشمیر ہے۔''

ایٹمی دھماکوں کے بعد دونوں ممالک کے رویوں میں تبدیلی سامنے آئی کہ مختلف مسائل کے با معنی حل کیلئے مذاکرات کیے جائے۔۳۵

بھارتی وزیراعظم واجپائی کے ۱۹۹۹ء میں دورہ پاکستان کے دوران ''اعلان لاہور'' جاری کیا گیا۔ اور اس بات کا تہیہ کیا گیا کہ کشمیر سمیت تمام تنازعات کو پر امن طریقے

سے حل کیے جائینگے۔ اسطرح مذاکرات کا ایک دور شروع ہو گیا۔ تاہم امن مذاکرات کے دوران کشمیری خود کو غیر محفوظ محسوس کر رہے تھے۔ حریت پسند تحریک دوبارہ منظّم ہوئی اور وادی کشمیر میں بھارتی فوج کے خلاف کارروائیوں میں مصروف رہیں۔

بھارتی حکومت نے پاکستان پر عسکریت پسندوں کی امداد اور کنٹرول لائن کے خلاف ورزی کے الزامات لگائے پاکستان نے ان الزامات کو مسترد کیا کہ یہ علاقے پاکستان کے اندر ہیں۔ تاہم بھارتی حکومت نے پاکستانی دعوے کو مسترد کرتے ہوئے مبینہ جارحیت کے خلاف سخت کارروائی کا اعلان کیا۔ اور اسطرح سے دونوں ممالک کے درمیان کارگل سیکٹر میں مئی۔جون۱۹۹۹ کے مہینوں میں جنگ شروع ہوئی۔ صورتحال کی بدتری کو دیکھتے ہوئے امریکہ نے جوہری جنگ کے خطرے کو محسوس کیا اور اسکو روکنے کی کوششیں کی۔۳۶

تھامس پکرنگ اور ریچرڈ انڈر فرت نے واشنگٹن میں بھارت اور پاکستانی سفیروں کو خطے میں کشیدگی پر تشویش کا اظہار کیا۔ اسکے بعد کئی امریکی اعلیٰ حکام جنرل انتھونی زنی، گبسن وغیرہ نے دونوں ممالک کے دورے کیے اور کارگل سے فوجیں نکالنے اور دو طرفہ مذاکرات کا راہ ہموار کرنے کی کوشش کیے۔

امریکہ کی مرکزی فوجی کمانڈ کے سربراہ جنرل انتھونی زنی نے اسلام آباد کے دورے پر وزیراعظم نوازشریف، آرمی چیف پرویز مشرف اور دیگر اعلیٰ حکام سے ملاقات کی اور صدر کلنٹن کا پیغام پہنچایا کہ پاکستان کسی بھی شرط کے بغیر کارگل سے اپنے افواج کو واپس بلائے۔ پاکستان نے کارگل کی نوعیت کو سامنے رکھتے ہوئے مسئلہ کشمیر کو حل کرنے کیلئے امریکہ کو قائل کرنے کی کوششیں کی لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔

اسی دوران امریکی دفتر خارجہ کے ترجمان جیمز روبن نے کہا کہ ہم بھارتی کنٹرول لائن سے پاکستان کی طرف سے افواج کے انخلاء کو دیکھنا چاہتے ہیں۔

اسی طرح کے رویہ سے صاف ظاہر ہوا کہ امریکہ نے کارگل معاملے پر کھُل کر بھارت کا ساتھ دیا اور پاکستان کو اس بحران کا ذمہ دار ٹھہرایا۔

۱۵ جون کو صدر کلنٹن نے نواز شریف کو فون کر کے کارگل سیکٹر سے اپنی افواج کے

انخلا کا کہا امریکہ کے دوست اور اتحادی ممالک نے بھی افواج کے انخلاء کیلئے پاکستان پر دباؤ ڈالا۔ ۳۷

صدر کلنٹن نے نواز شریف کو امریکہ مدعو کیا اور واشنگٹن میں ۶ جولائی کو ایک مشترکہ بیان میں کارگل سے پاکستانی افواج کے انخلا کا اعلان کیا۔ مشترکہ بیان میں یہ بھی بتایا گیا کہ صدر کلنٹن کی ذاتی دلچسپی ہے کہ لائن آف کنٹرول کی حرمت کو مکمل بحال کرے اور دو طرفہ کوششوں کی حوصلہ افزائی کیلئے کوشش کریں گے اور اسی حوالے سے بہت جلد جنوبی ایشیاء کا دورہ کریں گے۔

صدر کلنٹن کے سینئر مشیر بروس ریڈل لکھتا ہے کہ نواز شریف کے پاس دو راستے تھے یا اپنی افواج کو کنٹرول لائن سے واپس بلائے یا امریکی ہمدردی کے بغیر بھارت کے ساتھ ایک طویل اور خطرناک جنگ لڑے۔ ۳۸

کارگل مسئلے پر امریکی کردار کا نتیجہ واشنگٹن پوسٹ نے اس طرح اخذ کیا کہ ''صدر کلنٹن نے مسئلہ کشمیر کو ٹھنڈا کرنے کیلئے خود امریکی سفارتی کوششوں کی قیادت کی اور پاکستان بھارت بحران پر قابو پا لیا۔ جس نے جنوبی ایشیاء میں سٹریٹجک صورتحال کو تبدیل کر دیا۔ ۳۹ اس سے پہلے مسئلہ کشمیر پر امریکہ سیاسی طور پر باہر تھا لیکن اب اسکے ساتھ ہے اسکی وجہ یہ ہے کہ پاکستان اور بھارت دونوں جوہری طاقتوں کی طرف رواں دواں ہیں۔ لیکن مسئلہ کشمیر پر ان کے اختلافات ختم کرنے میں ناکام رہیں۔ جس کی ناکامی کے منفی اثرات اس علاقے میں امریکی مفادات پر ہونگے۔

کارگل بحران کے دوران یہ واضح ہو گیا کہ امریکہ کو مسئلہ کشمیر کو حل کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی بلکہ پاک بھارت بحران کو ختم کرنا اور معاملات کو موثر انداز میں منظّم کرنا امریکہ کی پالیسی رہی۔ دوسری طرف امریکہ نے کارگل بحران کا ذمہ دار پاکستان کو ٹھہرایا اور بھارت کے ساتھ خیر سگالی کی۔

امریکہ نے کارگل بحران جس طریقے سے سنبھالا اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ امریکہ کا مسئلہ کشمیر کے فوری حل میں کوئی دلچسپی نہیں۔

شیریں مزاری اپنی کتاب میں لکھتی ہے کہ کارگل جدوجہد کے دوران امریکہ نے پاکستان کو خبردار کیا کہ لائن آف کنٹرول پر کوئی کارروائی نہ کرے اور یہ محسوس کیا کہ پاکستان بریک مین شپ کا کھیل کھیل رہا ہے جو کہ امریکی خواہشات کے خلاف لگتا تھا۔[۴۰]

کارگل بحران کے دوران، امریکہ کا پاکستان پر دباؤ ڈالنا اور غیر مشروطی طور پر اپنے افواج کو واپس بلانا، امریکی پالیسی میں تبدیلی اور بھارت کی طرف جھکاؤ کا ایک اشارہ تھا۔

بروس ریڈل لکھتا ہے کہ بلیئر ہاؤس کے سربراہی اجلاس کا سب سے اہم نتیجہ امریکہ بھارت کے تعلقات پر اس کے اثرات کا تھا۔ جسکی وجہ سے امریکہ اور بھارت کے تعلقات کے وہ راہ ہموار ہوئی جو گزشتہ کئی دہائیوں سے بند بھارتی اشرافیہ، افواج اور عوام نے امریکہ کے حوالے سے اپنے منفی خیالات میں تبدیلی لانا شروع کیا۔[۴۱]

صدر کلنٹن نے مارچ ۲۰۰۰ء میں پاکستان اور بھارت کے دورے پر کہا کہ کشمیر پر امریکی پالیسی واضح ہے کہ پاکستان اور بھارت دونوں کے رہنماء مذاکرات کے ذریعے اسے حل کرے اور یہ واضح رہے کہ اس مسئلے کو تشدد کے ذریعے حل نہیں کیا جا سکتا اور ساتھ ساتھ کنٹرول لائن کا احترام کیا جانا چاہیے۔

کلنٹن کے دورے سے یہ واضح ہو گیا کہ امریکہ مسئلہ کشمیر پر ثالثی کا کردار ادا کرنے کیلئے تیار نہیں تھا۔[۴۲]

تاہم بھارتی پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کلنٹن نے کہا ''میرا پورا یقین ہے کہ پاکستانی حکومت کے اندر کچھ عناصر ہیں جو کشمیر میں تشدد میں مصروف لوگوں کی حمایت کرتے ہیں''[۴۳]

کلٹن کے بعد جنوری ۲۰۰۱ء میں بُش اقتدار میں آیا یہ وہ دور تھا کہ پاکستان امریکہ تعلقات ہنگامہ خیز دور سے گزر رہے تھے۔

بُش کی انتظامیہ مسئلہ کشمیر میں ملوث رہی اور بیورو آف انٹیلی جنس اور ریسرچ کے ساتھ ملکر ۲۰ اپریل ۲۰۰۱ء میں ایک کانفرنس کروائی جس میں امریکہ، پاکستان اور بھارت کے نامور دانشوروں نے حصہ لیا۔ اسطرح کی کانفرنس کا انعقاد اس بات کا اشارہ تھا کہ بش

انتظامیہ مسئلہ کشمیر میں گہری دلچسپی لے رہی تھی۔ چونکہ کانفرنس ناکامی کا شکار ہوئی لیکن اس نے دونوں ممالک کو قریب لانے میں اہم کردار ادا کیا اور مسئلہ کشمیر پر ممکنہ حل معلوم کرنے کیلئے بات چیت ہوئی۔

بُش انتظامیہ نے ایک اہم سہولت کار کا کردار ادا کرتے ہوئے جنرل مشرف اور وزیراعظم واجپائی کے درمیان جولائی ۲۰۰۱ء میں 'آگرہ سمٹ' منعقد کرائی۔ جس میں مسئلہ کشمیر سمیت کئی مسائل پر بات چیت ہوئی۔ بدقسمتی سے یہ کانفرنس بھی ناکامی کا شکار ہوا۔[۴۴]

اسکے بعد امریکی حکام اس نتیجے پر پہنچے کہ پاکستان بھارت اور کشمیریوں کا مسئلہ کشمیر پر مختلف اور متضاد دعوے ہیں جو اس مسئلے کے مصالحت میں روکاوٹیں ہیں۔

پاکستان اقوام متحدہ کی قرار دادوں کے مطابق مسئلہ کشمیر کا حل چاہتا ہے اور وادی میں رائے شماری کے حق میں ہے جبکہ بھارت کے ہاتھوں انسانی حقوق کی پامالی کے سخت خلاف ہے۔ جبکہ بھارت پاکستان کے خلاف سخت بین الاقوامی کارروائی کے حق میں ہے کہ پاکستان کشمیری حریت پسندوں کی مدد کر رہا ہے۔ ساتھ ہی بھارت نے کشمیر میں امریکہ کی ثالثی کردار کو مسترد کر دیا کہ یہ بھارت کی داخلی معاملات میں مداخلت ہے۔

نتیجہ

اپنے قیام سے لیکر اب تک پاکستان کیلئے سب سے بڑا مسئلہ کشمیر کا تنازعہ رہا ہے۔ مسئلہ کشمیر ان وجوہات میں شامل تھا جس کی وجہ سے پاکستان نے سرد جنگ میں امریکہ کا ساتھ دیا۔ امریکہ کا اتحادی ہونے کے ناطے پاکستان ہمیشہ یہ توقعات رکھتا رہا کہ امریکہ پاکستان اور بھارت کے درمیان ثالثی کے طور پر مسئلہ کشمیر کو حل کرنے میں اس کی مدد کریگا۔

لیکن امریکہ ہمیشہ پاکستان اور بھارت دونوں کی طرف سے دعوت کرنے پر اس مسئلے میں اپنا موثر کردار ادا کرنے کی شرط رکھتا رہا۔ تاہم سرد جنگ کے دوران امریکہ نے مسئلہ کشمیر کو اقوام متحدہ کی قراردادوں کے عین مطابق حل کرنے پر زور دیا۔

سرد جنگ کے اختتام کے بعد امریکہ بتدریجاً کشمیر میں رائے شماری کے مطالبے سے

دور ہوتا گیا اور اقوام متحدہ کے قراردادوں سے ہٹ کر اس مسئلے کو پاکستان بھارت باہمی مذاکرات کے ذریعے حل کرنے کی خواہش ظاہر کرتا رہا۔

مقبوضہ کشمیر میں بھارتی افواج کے ہاتھوں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے ثبوت کے باوجود امریکہ نے بھارت کے خلاف کوئی موثر ایکشن نہیں لیا۔ مقبوضہ کشمیر میں بھارتی ریاستی انتخابات کی حوصلہ افزائی کی اور اور کشمیریوں کو حق خود ارادیت دینے کے حوالے سے کوئی واضح پالیسی بنانے میں ناکام رہا۔

۱۹۹۰ء کے دہائی میں اگر ہم امریکی کشمیر پالیسی کا تجزیہ کرے تو اس میں بھارت کی طرف واضح جھکاؤ ہے۔ کیونکہ مسئلہ کشمیر کا حل امریکی مفادات کے زُمرے میں نہیں آتا۔ بلکہ اس نے اپنی معیشت کو وسعت دینے اورچین کے خلاف اپنی فوجی طاقت کو مضبوط کرنے کی غرض سے بھارت کے ساتھ قریبی دوستانہ تعلقات بنانے کا تہیہ کیا تھا اس لیے امریکہ نے مسئلہ کشمیر کو حل کرنے کیلئے بھارت پر دباؤ ڈالنا ضروری نہیں سمجھا۔ لیکن اس دہائی میں مسئلہ کشمیر پر جب بھی پاکستان اور بھارت کے درمیان کشیدگی پیداہوئی تو امریکہ نے اس کشیدگی کو دور کرنے میں ایک سہولت کار کا کردار ادا کیا۔ تاہم مسئلہ کشمیر کے حل کیلئے ایک منصفانہ اور موثر کردار ادا کرنے سے گریز کیا۔

اگر رائے شماری، انتخابات اور انسانی حقوق کی پامالی کو مد نظر رکھتے ہوئے امریکی پالیسی کا تجزیہ کیا جائے تو امریکی ڈپلومیسی کے تصورات میں کافی اختلافات پائے جاتے ہیں۔ اور اس کا متضاد اور دوغلا کردار بے نقاب ہو جاتا ہے۔

حوالہ جات

1. Donald James Johnson, *An Abstract of Military Aid as a Factor in Indo-Pakistan Relations* (New York: School of Education of New York University, 1965), pp. 252, 431.
2. C.I.A., Directorate of Intelligence, India and Pakistan: Two Years after Tashkent. Special Report, *Weekly Review,* Secret No. 1, SC No.

00754/68A, 26 January 1968, Approved for Release No 2002), p. 7.

3. Parma Sinha Paliat, "The Kashmir Policy of the United States: A Study of the Perception, Conflicts and Dilemmas," *Strategic Analysis*, Vol. xxv, no. 6 (New Delhi: September 2001), pp. 784-785.
4. Zulfiqar Ali Bhutto, *The Myth of Independence* (London: Oxford University Press, 1969), p. 139.
5. Abdul Sattar, *Pakistan Foreign Policy: A Concise History 1947-2005* (Karachi: Oxford University Press, 2007), pp. 225-226.
6. Pervaiz Iqbal Cheema, "Black laws for Kashmiris", *The News,* March 30, 2002.
7. "Oakley, Interview by Dr. Maleeha Lodi", *The News*, August 8, 1991.
8. Manoj Joshi, *The Lost Rebellion: Kashmir in the Nineties* (London: Penguin Books, 1999), p. 315.
9. Dennis Kux, *The United States and Pakistan 1947-2000: Disenchanted Allies* (Karachi: Oxford University Press, 2001), p. 304.
10. Rafique Akhtar, *Pakistan Year Book 1990-91* (Karachi: East and West Publishing Company, 1991), p. 331.
11. Farzana Shakoor, "Pakistan-India Relations", *Pakistan Horizon* Vol. 47, no. 3 (Karachi: July 1994), p. 49.
12. Devin T. Hagerty, "Kashmir and the Nuclear Question", in Charles H. Kennedy and R. B. Rais, ed., *Pakistan* (Lahore: Vanguard Books Ptv (Ltd), 1995), p. 183.
13. Manoj Joshi, p. 319.
14. Ershad Mahmud, *US Interest and Role in Kashmir Dispute 1947-2004* (Islamabad: The Institute of Policy Studies, 2004), p. 64.
15. Devin T. Hagerty, p. 183.
16. Manoj Joshi, p. 319.
17. Mushahid Hussain, "Kashmir Issue: The International Dimension," in Gul Mohammad Wani, ed., *Kashmir from Autonomy to Azadi* (Srinagar: Valley Book House, 1996), p. 239.
18. Dennis Kux, *The United States and Pakistan 1947-2000*, 340.
19. Parama Sinha Palit, p. 794.
20. Manoj Joshi, p. 315.
21. Mugsudul Hessian Nuri, *Indo-US Relations: The Economic Dimension* (Islamabad: Institute of Regional Studies, Summer 1995), p. 4.
22. Shabana Fayez, "Kashmir Conflict: US Post-Cold War Perspective", *Pakistan Journal of American Studies* Vol. 15, no. 1 and 2 (Islamabad: Spring and Fall 1997), p. 73.
23. Ershad Mahmud, p. 57.

24. "Let Plebiscite be the Litmus Test", *The Frontier Post,* February 21, 1997.
25. Shaheen Sehbai, "US Owns Wisner's views on Kashmir," *The Dawn,* August 6, 1996.
26. *The Frontier Post,* February 21, 1997.
27. Richard N. Hass, *After Tests: US policy towards India and Pakistan* (Washington DC: Brooking Institute, September 1998), p. 17.
28. Parama Sinha Palit, p. 793.
29. Manoj Joshi, p. 340.
30. Dennis Kux, p. 349.
31. Parama Sinha Palit, p. 794.
32. Moonis Ahmed, "New US Policy for India and Pakistan," *The News* March 16, 1997.
33. The News, May 13, 1997.
34. Tanmay Kanjilal, *"Improving Pakistan-India Relations: The US Role," Pakistan Horizon* Vol. 50, no. 3 (Karachi: July 1997), p. 35
35. "Kashmir Group Study", [Online] available: http://www/kasmirgroup.org/bottom.html, accessed 11-09-2015.
36. Shireen M. Mazari, *The Kargil Conflict 1999* (Pakistan: The Institute of Strategic Studies, September 2003), 32, p. 103.
37. Ershad Mahmud, p. 64.
38. Bruce Riedel, "American Diplomacy and the 1999 Kargil Summit at Blair House", *Policy Paper Series* (Philadelphia: Center for the Advanced Study of India, University of Pennsylvania, 2002), p. 13.
39. Arifa Noor, "Post-Cold War in South Asia", *The News,* September 10, 2000.
40. Shireen M. Mazari, p. 103.
41. Bruce Riedel, p. 16.
42. Iffat S. Malik, "Kashmir after Clinton", The News, March 29, 2000.
43. *The Daily Dawn,* April 4, 2000.
44. Ibid., July 30, 2001.